غلام ربانی عزیز*

علامہ نیاز فتح پوری اور اُن کا سفر کیمبل پور

Abstract: Allama Niaz Fatehpuri is known as an important figure in the history of Urdu literature. Allama Niaz Fatehpuri, with his critical, creative and scholarly abilities, created a movement in the world of Urdu poetry and literature in the first half of the twentieth century. His critical insight and extraordinary creative abilities increased the value of many genres of poetry and prose and in the fields of translation also his impact is valuable. His literary magazine "Nigar" undoubtedly nurtured many generations. He undertook a long journey from Bhopal to Campbellpur in ۱۹۲۹ at the behest of Professor Ghulam Rabbani Aziz and Dr. Ghulam Jilani Barq. In the present article, the details of his literary journey have been presented in detail by the renowned writer Professor Ghulam Rabbani Aziz. The details reveal many new things about Allama Niaz Fatehpuri, which are of importance to researchers and literary historians. In view of this importance, this unpublished article is being preserved in "Tabeer-e-Nau".

Key Words: Niaz Fatehpuri, Nigaar, Ghulam Rabbani Aziz, Ghulam Jillani Barq, Bhopal, Campbellpur, Literary Journalism.

کلیدی الفاظ: نیاز فتح پوری، نگار، جنّ، غلام ربانی عزیز، غلام جیلانی برق، بھوپال، کیمبل پور، ادبی صحافت۔

”پروفیسر غلام ربانی عزیز[۱۹۹۸ء تا ۲۰۰۰ء]ماضی قریب کے ایک معروف عالم، استاد اور دانش ور تھے۔ وہ اٹک کے ایک دُور افتادہ اور پس ماندہ گاؤں بسال کے ایک علمی گھرانے کے فردِ فرید تھے۔ اُن

*ماضی قریب کے معروف محقق، تدوین کار اور ماہرِ تعلیم۔

کے بڑے بھائی پروفیسر نور الحق علوی دیوبند کے فارغ التحصیل تھے اور کئی برس اورینٹل کالج، لاہور میں عربی کے اُستاذ رہے۔ ان کا شمار علامہ اقبال کے دوستوں اور علمی معاونین میں ہوتا ہے۔ عزیز صاحب کے برادرِ اصغر ڈاکٹر غلام جیلانی برق ممتاز ادیب اور ہندوستان گیر شہرت کے حامل دانش ور تھے۔ غلام ربانی عزیز اور غلام جیلانی برق کی تعلیمی اور تدریسی زندگی کا آغاز قریب قریب ایک ساتھ ہوا۔ ۱۹۲۸ء میں دونوں بھائی گورنمنٹ مڈل اینڈ نارمل اسکول، کیمبل پور [اٹک] میں اکٹھے ہو گئے۔ دونوں کے ذوقِ علمی نے اس ادارے میں شعر و ادب کا ماحول پیدا کر دیا۔ اُنھی کی سعی و کوشش سے ۱۹۲۹ء میں نام ور ادیب اور ادبی رسالے ''نگار'' کے مدیر علامہ نیاز فتح پوری نے کیمبل پور [اٹک] کا دورہ کیا۔ بھوپال سے اتنے بڑے ادیب کا اٹک جیسے پس ماندہ علاقے میں آنا، محض ان دو بھائیوں کے جذب و شوق کا اظہاریہ ہے۔ پروفیسر غلام ربانی عزیز نے علامہ نیاز فتح پوری کے سفر کی غایت اور روداد کو نہایت تفصیل اور سلیقے سے قلم بند کیا ہے۔ یہ گراں قیمت اور تحقیقی مضمون پہلی بار ''تعبیرِ نو'' میں شائع ہو رہا ہے۔''

(مدیر)

آج سے کوئی ساٹھ برس پہلے کی بات ہے کہ راقم گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی گھیب ضلع اٹک میں عربی اور اُردو پڑھاتا تھا۔ وہاں ایک عجیب رسم تھی کہ جب بھی وہاں کا ایس ڈی ایم تبدیل ہوتا، اسے ہائی اسکول کے ہال میں الوداعی پارٹی دی جاتی اور مدرسِ فارسی اور مجھے تبدیل ہونے والے افسر کی شان میں کچھ نہ کچھ عرض کرنا پڑتا۔ چوں کہ مدرسِ فارسی کو شاعری کا اِدّعا نہ تھا، اس لیے وہ کبھی زبانی اور کبھی کچھ لکھ کر نثری قصیدہ پیش کر دیتے مگر میں تخلص کا گنہگار تو تھا، اس لیے مجھے اپنا قصیدۂ مدحیہ نظم کی صورت میں پیش کرنا پڑتا۔ ایسے مواقع پر میری حالت قابلِ رحم ہوتی۔ جس شخص کو میں نے صرف دیکھا ہے اور وہ بھی دُور سے، اُس کی تعریف کیونکر کروں؟ نیز مدح گوئی ایک فن ہے، جس کے رموز و غوامض سے قطعاً نا سمجھ تھا۔ بہر حال میں نے دو چار اُلٹے سیدھے شعر گھڑ رکھے تھے، تھوڑے بہت ردّوبدل سے وہی پڑھ دیتا۔ لوگ سُن لیتے اور بلا ٹل جاتی۔

اس جھوٹی شاعری کی وقتی واہ واہ سے مجھے اُردو رسائل میں مضامین لکھنے کی تحریک ہوئی۔ چناں چہ لاہور سے شائع ہونے والے ایک رسالے ''قوسِ قزح'' میں چند مضامین شائع ہوئے مگر شاید ہی اُن کی کوئی کَل سیدھی ہو، مجلہ ''ہزار داستان'' کو ایک کہانی ''ناکام محبت'' جو ٹیگور کی ایک انگریزی کہانی کا ترجمہ تھی، برائے اشاعت روانہ کی۔ رسالہ بند ہو گیا اور کہانی گم ہو گئی۔ ''ہمایوں'' لاہور سے شائع ہونے والا بڑا مقبول رسالہ تھا۔ دریافت کیا: آیا ہمارے

"ملفوظات" کو "ہمایوں" کے صفحات پر جگہ مل سکے گی؟ جواب آیا آئندہ چھ ماہ تک تو ایک سطر کی گنجائش بھی نہیں نکل سکے گی۔ اس کے بعد غور ہو سکتا ہے، حوصلہ ہو تو انتظار فرمائیے۔

ایک دن میں سکول کی لائبریری کا جائزہ لے رہا تھا کہ مولانا محمد اسماعیل میرٹھی کا دیوان نظر پڑ گیا۔ اُلٹ پلٹ کر دیکھا تو ایک غزل کا مندرجۂ ذیل شعر میری توجّہ کا مرکز بن گیا، میں نے اس پر مزاحیہ رنگ میں ایک مضمون لکھا اور مولانا نیاز کو روانہ کر دیا۔ دو چار دن کے بعد مضمون بہ خیر و عافیت واپس آ گیا۔ مولانا نے حاشیے پر پنسل سے لکھا تھا: "تمھارا مضمون بُرا نہیں لیکن "نگار" میں اس طرزِ تحریر کی اشاعت نہیں ہو سکتی۔" گویا سر مُنڈاتے ہی اولے پڑے۔ اب شعر سُن لیجیے:

خاک اُڑتی جو تم خدا ہوتے
بندگی کا بھی حق ادا نہ ہوا

مولانا نیاز سے یہ پہلا تعارف تھا۔ ہر چند اس تقریب میں گرم جوشی کا عنصر مفقود تھا لیکن بالکل پھیکی اور بے نمک بھی نہ تھی۔ مولانا کا یہ فقرہ "مضمون بُرا نہیں" میری ڈھارس بندھاتا تھا۔ بعد میں یہ مضمون جناب ساغر سیمابی نے اپنے رسالے "پیمانہ" کے لیے رکھ لیا تھا۔ دو چار ماہ تو میرا اور اُن کا ساتھ رہا لیکن پھر وہ بیمار پڑ گئے اور رسالے کی اشاعت رُک گئی۔ بہر حال معلوم نہ ہو سکا کہ مضمون کا کیا حشر ہوا؟

نگار میں اشاعت نگاری:

"نگار" اسکول کی لائبریری میں آتا تھا۔ انھی دنوں اس میں ڈاکٹر محی الدین زور حیدرآبادی کا ایک مضمون شائع ہوا، جس میں غالب اور ذوق کا سر سری سا موازنہ کیا گیا تھا اور صاحبِ مضمون نے من وجہ ذوق کو ترجیح دی تھی۔ اُن کا یہ فیصلہ میرے عندیے کے خلاف تھا۔ میں غالب کا شیدائی تھا۔ اُس کی شوخ نگاری کے سامنے مجھے ذوق کی بے کیف خیال بندی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ میں نے صاحبِ مضمون کی تردید میں دو چار صفحے سیاہ کیے اور مولانا کو بھیج دیے۔ ہر چند میری پہلی کوشش ناکام رہی تھی لیکن اب کے بار میرے دل میں ایسا کوئی خدشہ نہ تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اتوار کا دن تھا، میں اور معلم فارسی گھومنے گئے تھے، لوٹے تو مجھے مولانا کا ایک پوسٹ کارڈ ملا، جس میں مرقوم تھا: "آپ کا مضمون ملا، یہ آپ پنڈی گھیب میں کیسے نکل آئے؟ مجھے تو اہلِ علم اور باذوق لوگوں کی تلاش رہتی ہے۔ آپ کا مضمون اگلے پرچے میں شائع ہو رہا ہے۔" چناں چہ "نگار" میں میرا پہلا مضمون دسمبر ۱۹۲۶ء کے پرچے میں شائع ہوا اور مولانا نے بہ یک جنبشِ قلم مجھے اہلِ علم اور باذوق لوگوں میں شامل کر لیا:

ع "جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے"

دو تین ماہ کے بعد ''نگار'' میں ''قسطاسِ مستقیم" کے عنوان سے عترت علی کا ایک محاکمہ شائع ہوا، جس میں مضمون نگار نے مجھے اور ڈاکٹر زور کو جنھوں نے ذوق کو غالب پر ترجیح دی تھی، خوب رگیدا، اُن کا یہ مضمون دو قسطوں میں اپریل اور مئی ۱۹۲۷ء کے ''نگار'' میں شائع ہوا تھا۔ بعد کے کسی پرچے میں مولانا نے اس محاکمے پر تبصرہ کیا تھا اور اُن کے اعتراضات کو سراسر غیر مناسب قرار دے کر میرے خیالات کی تائید فرمائی تھی۔

فارسی مثنویاتِ غالب:

ایک دفعہ مولانا نے مجھے لکھا کہ غالب کے اُردو کلام پر تو بہت کچھ لکھا پڑھا جا چکا ہے۔ اگر فرصت ملے تو اُس کے فارسی کلام بالخصوص مثنویات کا مطالعہ کیجیے۔ بعض چیزیں بڑی پُر لطف کہہ گیا ہے نیز مومن کا دیوان بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ میر کے بعد مومن ہی کا مقام ہے۔ بہ امتثالِ امر میں نے غالب کی مثنویات پر کچھ گزارشات پیش کیں، جو چار قسطوں میں شائع ہوئیں۔ اس دوران میں ایک صاحب نے اس سلسلۂ گفتگو میں کچھ تشنگی محسوس کی تھی اور مولانا نے بہرۂ استفسارات میں جواب دے کر اس کمی کی تلافی کر دی تھی۔ مومن کی شاعری پر میرا مضمون دو قسطوں میں شائع ہوا تھا۔

میری طبیعت کو مولانا اور اُن کے ''نگار'' سے کچھ ایسا دلی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا کہ میں اپنی بساط کے مطابق اُن کی خدمت کرنا چاہتا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ ہائی اسکولوں میں اس مضمون کی حیثیت اختیاری ہوتی تھی جو لڑکے اُردو نہیں پڑھتے تھے، وہ سائنس لے لیتے۔ عربی اور سنسکرت مشکل زبانیں تھیں۔ ان مضامین کے طلبہ کی تعداد بہت کم ہوتی تھی اور پھر یہ طلبہ اتنے بے سواد ہوتے تھے کہ ''نگار'' ایسے بلند پایہ رسالے کی خریداری کے لیے انھیں آمادہ کرنا حد درجہ مشکل تھا۔

راقم کیمبل پور میں:

حسنِ اتفاق سے مجھے پنڈی گھیب سے مڈل و نارمل اسکول، کیمبل پور (حال اٹک) میں بھیج دیا گیا۔ یہاں دو سیکشن جے وی کے اور ایک سیکشن ایس وی کلاس کا تھا۔ ہر چند ان لوگوں کا تعلق عموماً معاشرے کے نچلے طبقے سے ہوتا ہے کیوں کہ مڈل پاس کرنے کے بعد جو لوگ مالی دشواریوں کی وجہ سے تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے، وہ ان کلاسوں میں داخلہ لے لیتے ہیں لیکن مقابلتاً زیادہ مطیع اور فرماں بردار ہوتے ہیں۔ میں نے آتے ہی ''نگار'' کی خریداری کے لیے زمین ہموار کرنا شروع کر دی۔ چناں چہ سات طلبہ نے جو تھوڑے بہت خوش ذوق بھی تھے، اپنے نام ''نگار'' جاری کرا لیا، اس زمانے میں ''نگار'' کا سالانہ چندہ پانچ روپے تھا اور اس عہد کے پانچ روپے آج کے پچاس روپے سے زیادہ قدر و قیمت کے حامل تھے۔ سردیوں میں ایک روپے کے چونسٹھ انڈے ملتے تھے، گرمیوں میں یہ

تعداد دوچند (۱۲۸) ہو جاتی۔ خالص دیسی گھی روپے کا سوا سیر بہ آسانی دستیاب ہو جاتا۔ چینی ایک روپے ایک آنے کی پان سیر آتی تھی۔ بہرحال میں اپنی اس کارکردگی سے خوش تھا اور آس بندھ گئی تھی کہ جب اگلے سال (۱۹۲۹ء) ایس نئی جماعتوں کا داخلہ ہو گا تو ان شاءاللہ میری مساعی زیادہ بار آور ثابت ہوں گی۔

"نگار" کی خریداری:

خوبیِ قسمت سے ۱۹۲۸ء کا سال "نگار" کے زاویۂ نگاہ سے بہتر رہا۔ چناں چہ نارمل کلاسوں کے چوبیس (۲۴) طلبہ نے پرچہ اپنے نام جاری کرالیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اقتصادی بدحالی کی وجہ سے حکومت نے تمام سرکاری ملازموں کی تنخواہوں پر دس فی صد کٹوتی لاگو کر رکھی تھی۔ اخباروں اور رسالوں کے ایجنٹ مارے مارے پھرتے تھے اور جس دروازے پر دستک دیتے، اُسے بند پاتے تھے۔ "نگار" کی زندگی میں اس سے بیش تر شاید ہی کوئی ایسا بھلا دن آیا ہو گا۔ مولانا نے بھی میری بے لوث خدمات کو سراہا اور ملاحظات میں بطورِ خاص اس کا ذکر کیا۔

ڈاکٹر برق کیمبل پور میں:

اس سال اسکول کے سٹاف میں کافی ردّ و بدل ہوا۔ نئے ہیڈ ماسٹر نے مجھے نارمل کلاسوں کے ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ لگا دیا۔ نیز سارے ڈویژن میں جہاں کہیں بھی ایس وی کلاسیں تھیں، اُنھیں نارمل اسکول کیمبل پور میں منتقل کر دیا اور یوں اس اسکول کی حیثیت مقابلتاً بہتر ہو گئی۔ اسی اثنا میں میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر برق بھی نارمل اسکول لالہ موسیٰ سے تبدیل ہو کر یہاں آ گئے۔

نارمل جماعتوں کا نصاب:

شیخ نور الٰہی مرحوم، نارمل اسکولوں کے انسپکٹر تھے، وہ معائنے کے لیے آئے، محکمے نے ایس وی کلاسوں کے لیے اُردو کی جو نصابی کتاب منظور کی ہوئی تھی، وہ ناکافی ہونے کے علاوہ حد درجہ بے کیف اور خواب آور تھی۔ ہم دونوں بھائی ایس وی کو اُردو پڑھاتے تھے۔ میں پڑھا رہا تھا، دو چار منٹ کھڑے سُنتے رہے۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: "آپ انھیں کیا پڑھا رہے ہیں؟" میں نے کہا: "اس کلاس کے لیے یہی نصاب ہے۔ مجبوراً پڑھانا پڑتا ہے۔" "کوئی مجبوری نہیں، مولانا آزاد کی "آبِ حیات"، ڈپٹی نذیر احمد کی "توبتہ النصوح" یا اور کوئی کتاب، جس سے ان طلبہ میں اُردو سے لگاؤ پیدا ہو، پڑھا دیجیے۔ ان کا تعلق طلبہ کے اس گروہ سے نہیں ہے، جن کے نصاب مقرر ہوتے ہیں اور پھر اسی نصاب سے ان کا امتحان ہوتا ہے۔ شیخ صاحب بڑے دلچسپ آدمی تھے۔ یو پی سے آ کر لاہور

میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے۔ پھر ملتان میں ڈویژنل انسپکٹر ہو گئے اور آخر کار اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہو کر ریٹائر ہوئے۔ محکمہ تعلیم کو ایسا زندہ دل افسر شاید ہی پھر مل سکے گا۔

''بانگِ درا'' اور ''نگارستان'':

ہمیں اور کیا چاہیے تھا، ہم خود سخت اکتائے ہوئے تھے۔ شیخ صاحب کے یہ الفاظ ہمارے لیے آزادی کا چارٹر تھے۔ ہم دونوں بھائیوں نے طے کیا کہ اگر ان اساتذہ کو جو طلبہ کے روپ میں ہمارے زیرِ تربیت ہیں۔ ''بانگ درا'' اور مولانا نیاز کی ''نگارستان'' پڑھادی جائیں تو ممکن ہے ان کے ذہنوں میں بھی کوئی خوش گوار تبدیلی نمودار ہو جائے اور ان کے شاگرد بہتر نتائج پیدا کر سکیں۔ پورے چار برس یہ کتابیں اس درس گاہ میں پڑھائی جاتی رہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا نیاز کی ''نگارستان'' کا وہ ایڈیشن ختم ہو گیا تھا اور کتاب نایاب ہو گئی تھی۔

۱۹۲۸ء آہستہ آہستہ اپنے انجام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مولانا کے ساتھ خط کتابت کا سلسلہ وسیع تر ہو گیا تھا۔ ہر ہفتے ایک آدھ پوسٹ کارڈ ضرور آ جاتا۔ مولانا کا جواب ہمیشہ پوسٹ کارڈ کی شکل میں وارد ہوتا۔ وہ اس باب میں ''خیر الکلام ما قلّ و دلّ'' کے قائل تھے۔ اس طول طویل مراسلت میں، جو ۱۹۲۶ء سے شروع ہو کر مولانا کی وفات سے چند برس پہلے تک جاری رہی، جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے۔ اُنھوں نے صرف ایک دفعہ لفافہ لکھا تھا، جس میں ایک بل کے بارے میں وضاحت کی تھی۔

''جن'' کا اجرا:

انھی ایّام میں مولانا نے ایک نئے ماہ نامے کا اجرا کیا اور نام رکھا: ''جن'' درمیانہ کتابی تقطیع، حجم ۴۰-۴۵ صفحات، سالانہ چندہ دو روپے چار آنے تھا۔ پہلا نمبر یکم جنوری ۱۹۳۰ء کو شائع ہوا تھا۔ فہرستِ مضامین، حسبِ ذیل تھی:

۱۔ رسالہ جن کا اجرا اور اس کے مقاصد: مولانا لکھتے ہیں کہ: ''اس رسالے کا اجرا، صرف اسی مقصد کے ساتھ عمل میں آیا ہے کہ لوگوں کو روح و روحانیت کے متعلق معلومات بہم پہنچائی جائیں اور اس سلسلے میں اور جتنے علوم ظاہر ہو رہے ہیں، اُن کو بھی پیش کیا جائے۔''

۲۔ دُنیائے آب و گل سے دُور: مولانا لکھتے ہیں: ''آج کل یورپ اور امریکا میں باضابطہ انجمنیں قائم ہیں، جو عرصے سے روحانیت کے متعلق تحقیق کر رہی ہیں اور ان انجمنوں میں گراں پایہ علما شریک ہیں۔ ان لوگوں نے ناقابلِ تردید مشاہدات کی بنا پر یہ کلیہ قائم کیا ہے، کہ مرنے کے بعد انسان کی روح نہ صرف زندہ رہتی

ہے بلکہ اس کی پوری فردیت باقی رہتی ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی، آب و گل کی زندگی سے بڑی حد تک ملتی جلتی ہے۔"

۳۔ سبز پری: اس عنوان کے تحت شاہد نامی ایک نوجوان کی محبت کی روداد بیان کی ہے۔ جسے نہ تسلیم کیا جا سکتا ہے اور نہ انکار ہی ممکن ہے۔

۴۔ عالمِ ارواح اور جنسی شعور: دو روحوں کا عجیب و غریب بیان ہے۔

۵۔ خود نگاری: اس عنوان کے تحت روحوں سے بات چیت کرنے کے مختلف طریقے بیان کیے ہیں۔

۶۔ چشم دید معتبر روایات: اس عنوان کے تحت چار عجیب و غریب واقعے درج ہیں۔ ایک کے راوی دُنیائے ادب کی جانی پہچانی شخصیت جناب عبد الباری آسی ہیں۔ دوسرا واقعہ بیان کرنے والے منظور حسین وکیل پورنیا کے رہنے والے ہیں۔ تیسرے واقعے کے راوی کا نام (ف۔ح) بستی درج ہے۔ چوتھی روایت مجنوں گورکھ پوری کی ہے۔

۷۔ اقتباسات: اس میں مندرجہ ذیل تین موضوع زیرِ بحث لائے گئے ہیں:

۱۔ شخصی مقناطیسیت ۲۔ تنویم اور فریب ۳۔ قرأتِ افکار

بلاشبہ یہ سب موضوع نئے تھے اور سالانہ چندہ بھی معمولی تھا مگر بااین ہمہ رسالہ مولانا کی توقعات کے علی الرّغم صرف تیرہ مہینے چل سکا اور پھر بند ہو گیا۔ ہر چند مولانا کی اپنی خواہش یہی تھی کہ رسالہ چھپتا رہے۔ چناں چہ اُنھوں نے جنوری ۱۹۳۱ء کے شمارے کے آخر میں اس کا بالوضاحت اعلان کیا بھی لیکن خریداروں کی دل چسپی ختم ہو چکی تھی۔ اُنھوں نے چندہ نہ بھیجا اور رسالہ بند کرنا پڑا۔

مولانا کو کیمبل پور کی دعوت:

خط کتابت کو نصف ملاقات کہتے ہیں لیکن ہماری خط کتابت اس سے دو چار قدم آگے تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو کہ مولانا سے بالمشافہہ گفت و شنید کا موقع ملے۔ مشہور ہے بلی کے خوابوں میں چھیچھڑے۔ راقم نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ مولانا کیمبل پور آئے ہیں اور میرے کمرے میں کرسی پر بیٹھے ہیں۔ صبح اُٹھا تو خواب از بر تھا۔ خیال آیا کہ اگر مولانا ایک آدھ دن کے لیے آ جائیں تو مزا ہی آ جائے لیکن جب سوچتا کہ لکھنؤ اور کیمبل پور میں کالے کوسوں کی منزلیں حائل ہیں، تو دل بیٹھ جاتا۔ بہر حال جی کڑا کر کے خواب کی نوید قلم کی زبانی مولانا کے کانوں تک پہنچا دی۔ وہاں سے جواب آیا کہ میں نے بھی کچھ ایسا ہی خواب دیکھا ہے کہ میں کیمبل پور میں ہوں اور آپ میرے سامنے ایک ایسی فہرست رکھ رہے ہیں، جس میں سو خریداروں کے نام ہیں۔ گویا بہ الفاظِ دیگر

مولانا کا مطلب یہ تھا کہ اگر رادھا کو ناچنا ہے تو نو من تیل کا بندوبست فرمائیے، ہو سکتا ہے کہ مولانا نے یہ شرط اس لیے عائد کی ہو کہ نہ سو خریدار بن سکیں گے اور نہ ہم اپنا تقاضا دُہرائیں گے اور یوں وہ دُور دراز سفر کی صعوبت سے بچ جائیں گے لیکن ہم بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے، لکھ دیا کہ تشریف لے آیئے تیل کا انتظام کر لیا گیا ہے۔

مولانا کی آمد:

دسمبر کا مہینہ تھا۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ مولانا ۱۸ر کی صبح کو کلکتہ میل سے آ رہے تھے۔ میں اور عزیزی برق چند طلبہ کی معیت میں ریلوے سٹیشن پر مولانا کے استقبال کو موجود تھے۔ ہم نے مولانا کی تصویر ضرور دیکھی تھی لیکن خود اُنھیں نہیں دیکھا تھا۔ گاڑی آ کر رُکی تو اِدھر اُدھر ڈبوں میں جھانکنے لگے۔ ہمارا خیال تھا وہ انٹر کلاس میں ہوں گے۔ انٹر کی دو ایک بوگیاں تھیں۔ کہیں نظر نہ آئے، آخر سیکنڈ کے ایک ڈبے میں مل گئے۔ ہمارا سکول وہاں سے بہ مشکل دو اڑھائی فرلانگ تھا۔ نیز یہ وہ زمانہ تھا کہ لوگ پیدل چلنے میں کوئی سبکی محسوس نہیں کرتے تھے۔ ہم مولانا کو پاپیادہ ہی ہوسٹل تک لائے۔ ہم دونوں بھائی ابھی تک خانہ بدوشانہ زندگی گزار رہے تھے۔ میں نے اپنے کمرے ہی میں مولانا کے لیے ایک چارپائی بچھوا دی۔ اس دن ہفتہ تھا، ناشتے کے بعد سکول کا وقت شروع ہو گیا۔ چوں کہ ہوسٹل اور اسکول ایک ہی احاطے میں تھے، اس لیے "دل بہ یار و دست بہ کار" والا معاملہ تھا۔ پیریڈ ختم ہوتا تو آ جاتے۔ ہفتہ آدھی چھٹی کا دن تھا۔ بارہ بجے فارغ ہو گئے۔ بعض اساتذہ اور طلبہ بھی ملاقات کو آئے۔ پہلا دن بدمزہ سا تھا۔ مولانا اچکن اور پتلون میں ملبوس تھے۔ سارا دن جکڑے رہے۔ پہلے کرسی پر بیٹھے رہے۔ تھک گئے تو میں نے کہا: "مولانا چارپائی پر تشریف رکھیے۔" اسی لباس میں وہاں بیٹھ گئے۔ چارپائی اونچی تھی۔ مولانا کے پاؤں درمیان میں اٹک کر رہ گئے۔ آخر ایک بھلے مانس کو مولانا پر رحم آیا اور اُس نے ایک تپائی مولانا کے پاؤں کے نیچے رکھ دی۔ جس سے وہ تناؤ ختم ہو گیا۔ جب بھی وہ نقشہ میری آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو از حد ندامت ہوتی ہے کہ کیوں مولانا کو میری وجہ سے یہ تکلیف ہوئی۔ یہ میرا فرض تھا کہ اجنبیت کے حجاب کو جلد از جلد درمیان سے اُٹھوا دیتا کہ اُن کی طبیعت پر بوجھ نہ پڑتا اور وہ خود کو پُرسکون محسوس کرتے۔

مولانا ایک دعوت میں:

اسکول کے ہاسٹل کے مشرق میں انٹرمیڈیٹ کالج کا ہاسٹل تھا۔ جس کے سپرنٹنڈنٹ ہمارے احباب میں سے تھے۔ اسی رات کو اُنھوں نے میاں احسان الحق سیشن جج کو کھانے پر بُلایا تھا۔ جس میں ہم دونوں بھائی بھی مدعو تھے۔ جب اُن کا دعوتی رقعہ موصول ہوا تو میں نے اُن سے درخواست کی کہ اتفاقاً مولانا نیاز آج

میرے یہاں تشریف فرماہیں۔ اگر زحمت نہ ہو تو انھیں بھی مدعو کر لیجیے، ورنہ میری شرکت مشکل ہو جائے گی۔ اُنھیں کیا عذر ہو سکتا تھا؟ مولانا بھی مان گئے اور رات کو ہم اس دعوت میں شریک ہوئے۔

میاں احسان الحق بڑے خوش ذوق اور بامذاق آدمی تھے۔ شعر و سخن کا لپکا بھی تھا۔ علی گڑھ میں تعلیم پائی تھی اور وہاں کی روایات کے شدّت سے پابند تھے۔ جس مجلس میں ہوتے، چھا جاتے۔ ہم مولانا کو لے کر وہاں پہنچے تو میاں صاحب ابھی نہیں آئے تھے، تھوڑی دیر میں آ گئے۔ میں نے مولانا سے تعارف کرایا تو اُن سے بغل گیر ہو گئے۔ ہر چند مولانا کم آمیز نہ تھے لیکن اتنے زود آمیز بھی نہ تھے کہ مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ مولانا بغل گیر ہوتے وقت میاں صاحب کی طرح گرم نہ تھے۔ بعد میں جب اُنھوں نے رنگِ محفل دیکھا تو جلدی ہی شیر و شکر ہو گئے۔ میاں صاحب نے ایک شعر پڑھا اور کہا کہ یہ فلاں شاعر کا ہے۔ مولانا نے تصحیح کی اور کسی دوسرے شاعر سے منسوب کیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد میاں صاحب نے پھر ایک شعر پڑھا اور مولانا سے شاعر کا نام پوچھا۔ مولانا نے کہا اس کا مجھے علم نہیں۔ بہر حال یہ پُر لطف محفل دیر گئے رات تک جاری رہی۔

اثنائے گفتگو میں میاں صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے مولانا سے کہا: ''نیاز صاحب! یہ آپ کے میزبان بے قافیہ و ردیف نظمیں کہتے ہیں، انھیں منع کیجیے۔'' مولانا نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: '' قافیہ اور ردیف شعر کا زیور ہیں۔ میں تو ایسا شعر جس میں یہ دو چیزیں نہ ہوں، دیکھ بھی نہیں سکتا۔''

محفل برخاست ہونے کو تھی کہ میں نے میاں صاحب سے کہا: ''کل مولانا ایس وی کلاس کو ایک لیکچر دیں گے، اگر آپ کو فرصت ہو تو زحمت فرمائے گا۔'' میں نے بات ختم ہی کی تھی کہ مولانا جھٹ بول پڑے: ''میاں صاحب! اس خبر میں کوئی صداقت نہیں ہے۔'' بہر حال میاں صاحب نے دعوت قبول کر لی اور کہا کہ جب مولانا سے بات طے ہو جائے تو مجھے خبر کر دیجیے گا، میں آجاؤں گا۔ مولانا کے اندازِ انکار ہی سے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کسی ایسے لیکچر پر آمادہ نہ ہوں سکیں گے، جس میں چند مقامی پڑھے لکھے لوگوں کو شرکت کی دعوت دی جائے اور مولانا اُن کے سامنے کسی علمی یا ادبی موضوع پر اظہار خیالات کریں۔ چناں چہ ایسا تماشا نہ ہوا۔

مولانا سے دل لگی:

دوسری صبح کو اتوار تھا، بارش ہو رہی تھی۔ مولانا نے شیو کیا اور منہ دھونے غسل خانے میں گئے۔ ہمارے یہاں پانی گرم کرنے کا نہ انتظام تھا نہ کبھی اس تکلف کی ضرورت ہی محسوس کی گئی تھی۔ ماشکی صبح سویرے سکول کے کنوئیں سے پانی لے آتا اور دوسری صبح تک اُس سے کام چلایا جاتا۔ میں نہانے کو جا رہا تھا کہ مولانا فارغ ہو کر نکلے۔ سردی سے کانپ رہے تھے۔ میں نے پوچھا: ''مولانا! غسل کا ارادہ ہے؟'' کہنے لگے: ''صاحب! خودکشی کر

لیں گے، نہائیں گے نہیں۔‘‘ناشتے کے بعد گپ شپ شروع ہوئی، مولانا ٹیگور کے بڑے مداح تھے۔ چناں چہ اُن کی ’’گیتا نجلی‘‘ کا اُنھوں نے ہی اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کتاب کے پہلے مولانا کا فوٹو بھی تھا۔ انچ ڈیڑھ انچ سیاہ ڈاڑھی تھی۔ سر پر انگریزی طرز کے بال تھے۔ ایک سیاہ رنگ کی چادر تہ کر کے، ایک پلو دائیں کندھے کے اوپر سے گزار کر بائیں بغل کے نیچے تک لایا گیا تھا۔ اس تصویر کا ذکر چھڑا۔ تو ایک شریکِ محفل نے (بغیر سوچے سمجھے) کہہ دیا: ’’مولانا! اس تصویر میں تو آپ اچھے خاصے گڈریے لگتے ہیں‘‘ بات نہایت نامناسب تھی۔ مولانا ہمارے مہمانِ عزیز تھے، عمر میں ہم سے بڑے، رہا علم و فضل، ہماری اتنی حیثیت بھی نہ تھی کہ ہم اُن کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے والوں میں شامل ہو سکتے۔ کہاں لکھنؤ کے طور طریقے اور وضع داری اور کہاں ہماری خو بو اور گنوار پن، مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا لیکن کیا ہو سکتا تھا۔ مولانا بات کو پی گئے اور صرف اتنا کہا: ’’ہاں وہ پوز میں نے جان بوجھ کر اختیار کیا تھا۔‘‘ بات آئی گئی ہو گئی مگر ہمارا پول کھل گیا۔

تلفّظِ الفاظ:

ایس وی کلاس کی تدریس کے دوران میں صحتِ تلفظ، ہمارے لیے مستقل دردِ سر بنی ہوئی تھی۔ مولانا کے سامنے یہ بحث چھڑی تو میں نے دریافت کیا: ’’مولانا! اس باب میں کس لغت سے مدد لینا چاہیے؟‘‘ مولانا نے جواب دیا: ’’المنجد‘‘ ہر چند میرے سوال کا جواب درست نہیں تھا، کیوں کہ ’’المنجد‘‘ کا دائرہ صرف عربی الفاظ تک محدود ہے اور اُردو میں درجن بھر زبانوں کے الفاظ ملتے ہیں، بہر حال میں نے فوراً ’’المنجد‘‘ منگوائی اور مولانا سے پوچھا کہ: ’’فضا اور شکوہ میں حرفِ اوّل پر زبر پڑھیں گے یا زیر؟‘‘ مولانا نے جواب دیا: ’’دونوں زیر سے پڑھے جائیں گے۔‘‘ (یعنی فِضا اور شِکوہ)۔ المنجد دیکھی گئی تو اُس کا فتویٰ مولانا کے خلاف تھا۔ شکوہ کے بعد شکایت کا لفظ بکسرِ اوّل مذکور تھا۔ مولانا کہنے لگے: ’’شِکوہ بہ کسرِ شین اس شکایت سے ماخوذ ہے۔‘‘ یہ ایسا جواب تھا، جس سے کوئی بھی مطمئن نہیں ہو سکتا تھا لیکن میں مولانا سے بحث میں اُلجھنا نہیں چاہتا تھا۔ حالاں کہ میرے سوال کا جواب صرف اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ ان الفاظ کا صحیح تلفّظ وہی ہے، جس طرح اہلِ زبان بولتے ہیں کیوں کہ جب کوئی زبان کسی دوسری زبان کا لفظ اپناتی ہے، تو اُسے اس میں ہر طرح کے تصرّف کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ نَقص (بہ فتحِ اوّل) نُقص بن گیا۔ خلوت (بہ فتحِ اوّل) کو خِلوت بنا لیا گیا وغیرہ وغیرہ۔

مولانا کا لیکچر:

دن کے گیارہ بج چکے تھے اور مولانا کے ارد گرد ابھی تک طلبہ کا جمِ غفیر تھا۔ میں نے اپنی درخواست پھر دُہرائی: ’’مولانا! طلبہ آپ کے لیکچر کے لیے اصرار کر رہے ہیں۔‘‘ مولانا سمجھ چکے تھے کہ یہ کڑوی گولی نگلنا ہی

پڑے گی، کہنے لگے: ”اچھا! آپ لوگ تھوڑی سی دیر کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دیں، تاکہ میں اپنے خیالات مجتمع کر کے کسی موضوع پر غور کر سکوں۔“ہم اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے اور مولانا قلم اور کاغذ لے کر بیٹھ گئے جب مقالہ لکھ چکے تو مجھے بُلایا کہ طلبہ کو ہال میں جمع کیجیے، میں آتا ہوں۔ مولانا کے لیکچر کا ماحصل نظیری کا مندرجہ ذیل شعر تھا:

درسِ ادیب اگر بود زمزمۂ محبتے
جمعہ بمکتب آورد طفلِ گریز پائے را

آٹھ صفحے تھے۔ جو نہایت فصیح و بلیغ انداز میں لکھے گئے تھے۔ چوں کہ موقع و محل کے مناسب تھے، اس لیے پسند کیے گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل و دماغ سے وہ تاثیر، اتنا زمانہ گزر جانے کے باوجود تاحال جُدا نہیں ہوئی۔ ہر چند مولانا کو اس سے پیشتر کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا ہو گا لیکن اُنھوں نے اپنے کردار کو بڑے پُر اعتماد طریقے سے نبھایا۔ سردی سے تھوڑی بہت کپکپاہٹ ضرور تھی۔ چناں چہ روسٹرم کے پاس دہکتی انگیٹھی رکھی ہوئی تھی مگر الفاظ کی ادائیگی [ادائی] بالکل درست تھی۔

مقالہ ختم ہوا تو میں نے طلبہ سے مخاطب ہو کر کہا: ”اگر آپ کو کوئی سوال پوچھنا ہو، یا کسی بات کی وضاحت مطلوب ہو، تو اجازت ہے۔“مگر کسی نے کچھ نہ پوچھا۔ آخر جلسہ برخاست کرنا پڑا، طلبہ اپنی اپنی ڈار میٹری کو چلے گئے اور مولانا کو میں اپنے کمرے میں لے آیا۔

تخلیے کی گفتگو:

اس تخلیے میں مولانا نے مجھ سے کہا کہ: ”میں ایک ذاتی معاملے میں آپ کی مدد کا طلب گار ہوں۔“میں چوکنا ہو گیا کہ خُدا خیر کرے، میں بھلا کس مدد کے قابل ہوں؟ میں نے عرض کیا: ”ارشاد فرمایئے “کہنے لگے: ”میری صرف ایک لڑکی ہے (نام غالباً شوکت بتلایا تھا) اولادِ نرینہ سے محروم ہوں، عمر پچاس کے لگ بھگ ہے، اب مشکل ہے کہ میرے یہاں اور کوئی اولاد ہو، میں کسی ایسے پنجابی لڑکے کی تلاش میں ہوں جو بے وسیلہ ہو مگر شریف خاندان سے ہو تو میں خود اُس کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اپنے سر لوں گا اور جب وہ جوان ہو جائے گا، تو اُسے اپنی بیٹی سے بیاہ کر اپنا وارث قرار دوں گا۔“میں نے پوچھا: ”مولانا! آپ نے پنجابی ہونے کی تخصیص کیوں فرمائی؟“کہنے لگے: ”پنجابی مقابلتاً وفادار ہوتے ہیں۔“میرے لیے یہ عجیب انکشاف تھا۔ میں خود پنجابی تھا، جب میں نے گریبان میں جھانکا تو مجھے اس جنسِ گراں مایہ کا کہیں نام و نشاں تک نظر نہ آیا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں نے مولانا کو اپنے جیسا

کوئی ناہنجار تلاش کر کے دے دیا، تو خُدا اُن پر رحم کرے، وہ عمر بھر مجھے کوستے رہیں گے۔ بہر حال اس موضوع پر اور بھی کئی باتیں ہوئیں۔ مولانا نے اپنے دماغ میں اس بچے کی تعلیم و تربیت کا جو خاکہ تیار کر رکھا تھا۔ سرسری انداز میں اس کی ایک جھلک بھی دکھائی۔

میں نے مولانا سے وعدہ کر لیا کہ میں اپنی طرف سے ضرور کوشش کروں گا لیکن میرے لیے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ دُنیوی معاملات میں، حد درجہ کودن واقع ہوا ہوں۔ ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھتا ہوں اور میرے اصول کے مطابق ہر آدمی شریف اور قابلِ اعتماد ہے، جب تک کہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ ایسا نہیں ہے۔ چناں چہ میرے دماغ میں دو چار اُمیدوار پیش ہوئے بھی لیکن مجھے سب ایک جیسے نظر آئے۔ ردّ و قبول کا فیصلہ مشکل ہو گیا۔ مسلمان خواہ مخواہ تقدیر کا قائل نہیں ہوا۔ اس کے ذاتی تجربے کے پیچھے صدیوں کی روایات ہیں۔ جو اُسے بولنے نہیں دیتیں۔ اس مثال میں بھی جو کچھ مقدر ہو چکا تھا، وہ مولانا کی نظروں سے اوجھل تھا۔ اس لیے تو اُنھوں نے ایسے اہم کام کے لیے میرا انتخاب کیا۔ ورنہ مولانا کے حلقۂ احباب میں ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی۔ جو اُن کے کہنے پر آسمان کے تارے توڑ لاتے۔ چناں چہ میری معلومات کے مطابق مولانا نے بعد میں اپنے خاندان کی کسی بیوہ خاتون سے نکاح کر لیا اور خُدا نے اُنھیں صاحب زادے بھی دیے اور غالباً ایک آدھ اور صاحب زادی بھی۔ جبھی تو قرآن میں کئی مقام پر ارشاد ہوا ہے: لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللهِ۔

مولانا کی واپسی:

آج رات کو مولانا نے واپس جانا تھا۔ ہم بُجھے بُجھے سے تھے کہ مولانا ہم سے رخصت ہو رہے ہیں۔ گاڑی رات کو ساڑھے نو بجے چھوٹتی تھی۔ رات کا کھانا کھا چکے تو ہم نے مولانا کو خریداروں کی فہرست دی۔ ۶۳ خریدار "نگار" کے تھے اور ۳۲ خریدار "جن" کے۔ اس پرچے کا ایک آدھ شمارہ آ چکا تھا۔ یہ ایں انداز مولانا کی شرط بھی پوری ہو گئی اور ہم بھی اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ مولانا کو پیدل ہی سٹیشن پر لے گئے۔ گاڑی آئی تو سیکنڈ کلاس کی ایک بوگی میں اوپر کی برتھ مل گئی۔ مولانا کے رفیقانِ سفر سارے کے سارے گورے فوجی تھے، میں متوحش سا رہا۔ اُمید ہے کہ رات خیریت سے گزر گئی ہو گی۔ ورنہ مولانا کچھ نہ کچھ ضرور لکھتے۔

مولانا لاہور میں:

مولانا نے ہمارے یہاں دو دن اور ایک رات بسر کی تھی۔ ان دنوں کیمبل پور میں ماہِ دسمبر میں کڑاکے کی سردی پڑتی تھی۔ اس پر مستزاد بارش گویا مرے پر سو دُرّے کا سماں بندھ جاتا۔ ہم نے مولانا کے لیے انگیٹھی کا بندوبست کر رکھا تھا۔ جب تک کوئلے دہکتے رہتے، مولانا تاپتے رہتے اور بُجھ جاتے تو کانپنا شروع کر دیتے۔ اس

مہمانِ محترم کے آنے سے ہم پر ایک عجب کیف طاری تھا اور چوں کہ ہماری شیفتگی مے وانگبیں کی لاگ سے سراسر پاک تھی، اس لیے مولانا ہمارے خلوص اور فدائیت سے خاص طور پر متاثر تھے۔ ہر چند پہلے دن کے تکلّف سے مولانا کو ذہنی اور جسمانی طور پر تھوڑی سی ناآسودگی سے واسطہ رہا تھا لیکن دوسرے دن ہم نے یہ بساط اُلٹ کر رکھ دی تھی اور صورتِ حال ایسی ہوگئی تھی گویا ہم مدتوں اکٹھے رہے ہوں۔ مولانا کے چلے جانے کے بعد ہم دوسرے دن صبح اُٹھے تو مولانا کی یاد اُن کے تعاقب میں لاہور پہنچ چکی تھی اور وہ اختر شیرانی کی تلاش میں فلیمنگ روڈ کے آس پاس گھوم رہے تھے کہ رفیعی اجمیری سے سر راہِ ملاقات ہوگئی اور وہ اُنھیں اپنے مکان پر لے گئے۔ مولانا مہمان تو اختر شیرانی کے تھے لیکن قیام فرمایا رفیعی اجمیری کے مکان پر۔

پنجاب کے قدیم شہروں میں، پرانے لاہور کو یہ شرف حاصل ہے کہ سوائے قدیم سری نگر کے اور کوئی شہر تعفن، بدبو، غلاظت اور گندگی میں اس کا ہم سر نہیں ہو سکتا۔ پروفیسر محمود شیرانی فلیمنگ روڈ کے ایک سرائے نما مکان میں قیام فرما تھے۔ راقم کو بھی دو ایک دفعہ عرضِ نیاز کے لیے وہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ کچھ اس طرح یاد پڑتا ہے کہ مکان کے چوکور صحن میں رات کو تانگے کے گھوڑے بندھتے تھے اور بالاخانے کے ایک حصے میں پروفیسر مرحوم سکونت رکھتے تھے۔ وہ علاقہ بارش کے ایام میں کچھ زیادہ ہی متعفن ہو جاتا تھا۔ مولانا اس کریہہ منظر سے سخت متنفر ہوئے اور ہر چند وہ ہفتہ بھر کے قیام کا ارادہ کر کے آئے تھے لیکن ناگوار ماحول نے احرام کھولنے پر مجبور کر دیا، دوسرے ہی دن بستر گول کیا اور نو دو گیارہ ہو گئے۔

فروری ۱۹۳۰ء کا ''نگار'':

مولانا نے کیمبل پور کے لیے رختِ سفر باندھا تھا تو جنوری ۱۹۳۰ء کا ''نگار'' مطبع کے حوالے کر آئے تھے۔ ہمیں فروری کے پرچے کا انتظار تھا۔ دیکھیں، مولانا کیا تاثر لے کر گئے ہیں۔ رسالہ آیا تو اس میں سات صفحے (۷۷ سے ۸۳ تک) اس سفر کی سرگذشت کے لیے وقف تھے۔ شروع میں کچھ بیگم سے نوک جھونک ہے، پھر وجہِ سفر بیان کی ہے اور لگے ہاتھوں سفر کی مختلف قسمیں گنادی ہیں۔ جن میں ایک سفر آخرت بھی ہے۔ لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر اختر شیرانی، رفیعی اجمیری اور مولانا غلام رسول مہر سے ملاقات کا ذکر ہے۔ اختر مرحوم اور اس کی حقیقی یا فرضی محبوبہ سلمٰی پر بھی دو چار فقرے لکھ گئے ہیں:

> ''اختر شیرانی بظاہر نوجوان ہیں، نشاط کا موسم رکھتے ہیں اور مرادوں کے دن کے مالک ہیں لیکن میں دیکھتا ہوں کہ یہ غریب اپنے آلامِ روحانی کے چھپانے کے لیے یک گونہ بے خودی قائم رکھنے پر قادر نہیں ہے۔''

جو لوگ اختر کے قریبی حلقۂ احباب میں شامل تھے ممکن ہے، اُن میں سے کوئی شخص اختر کی عالم بیزاری اور دل گرفتگی کی وجوہ سے حجاب اُٹھا سکے۔ اس وقت اس کا مشہور اور غیر فانی نوحہ، جس کا مطلع ہے:

اے عشق کہیں لے چل
اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہِ عالم سے
لعنت گہٗ ہستی سے

میرے سامنے ہے، اتنی دردناک اور پُر سوز نظم اُردو زبان میں شاید ہی کسی اور شاعر کے قلم سے نکلی ہو گی۔ سلمٰی اور سلیمیٰ کے علاوہ طفلِ حسین اور خضرِ جمیل کا ذکر کیے بغیر بھی نہ رہ سکا۔ ذیل کے بند سے اس کے بے پناہ سوزِ دل اور الم ناکی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

اِک ایسی جگہ جس میں
انسان نہ بستے ہوں
یہ مکر و جفا پیشہ
حیوان نہ بستے ہوں
انساں کی قبا میں یہ
شیطان نہ بستے ہوں
تو خوف نہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

میں اس جواں مرگی اور اسی طرح انشاجی کی بے وقت موت سے بہت متأثر ہوا تھا۔ نہ معلوم ہمارا ادب ان کی رحلت سے کتنے قابلِ فخر ادبی شاہ کاروں سے محروم ہو گیا اور ہمارے چمنستانِ شعر و نغمہ کو کب تک اپنی بے نوری کا ماتم کرنا ہو گا تاکہ کوئی اختر یا انشاجی اپنی نوائے جگر سوز کی دل نوازلَے سے ماحول کی یبوست اور مُردہ دلی کو احساس اور تڑپ کی دولت سے مالا مال کر دے۔

زینہا باید کہ تا یک سنگِ اصلی ز آفتاب
لعلِ گوہر در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

ٹیکسلا پہنچے تو مولانا کی یاد داشت اُنھیں اُس عہد میں لے گئی، جب مہم جو آریاؤں کے گروہ وسطِ ایشیا سے یہاں وارد ہوئے تھے۔ چناں چہ مولانا نے ان ادوار کا مختصر تذکرہ کہہ سُنایا، جو اس سرزمین کو پیش آچکے ہیں۔ کیمبل پور وارد ہوئے تو ہم دو بھائیوں ،ڈاکٹر غلام جیلانی برق اور خاکسار راقم کے بارے میں دوچار فقرے ارزانی فرمادیے:

> ''فضا ابر آلود تھی اور خنکی کی شدت تاب گسل جب یکسر پیکرِ صدق وصفا (یعنی راقم) اور مجسمہ لطف و کرم (یعنی عزیزی برق) کی گرم جوشیوں سے دوچار ہوا۔ اگر ان حضرات کا وجود نہ ہوتا تو میرے دل کی سرشاریاں اور ''نگار'' کی پُر کاریاں ، شاید اس حد تک نہ پہنچ سکتیں۔''

دوچار جملے کیمبل پور کے محلِ وقوع ،ماحول اور صحت بخش آب وہوا کے بارے میں لکھ کر اہلِ پنجاب کے بارے میں اپنے تجربات کا بایں انداز اظہار فرماتے ہیں:

اہلِ پنجاب کے بارے میں مولانا کی رائے:

> ''اہل پنجاب کے بارے میں میرے تجربات کچھ بھی ہوں، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جب تک ترقّی وتمدن کی خرابیاں اس قوم میں پیدا نہ ہوں۔ یہ قوم اس قدر معصوم ،نیک اور سادہ دل ہے کہ ایک شخص نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ ان پر اعتماد کر سکتا ہے۔ جوش و ولولہ، عزم وارادہ ، محنت و جفاکشی اس جماعت کی خصوصیتِ خاصہ ہے، جس نے ان کو ''زندہ دل''، خطاب کا مستحق بنادیا ہے لیکن جس حد تک جمالیاتی و تخلیقی دماغ کا تعلق ہے۔ اس کی فطرت لچکیلی Elastic ہونے کی بجائے خستہ Brittle نظر آتی ہے۔ آپ جب تک آرٹ کے لطیف پہلو سے لطف اُٹھارہے ہیں ، پنجابی دل چسپ جلیس ہے لیکن جہاں آپ نے آرٹ کے نقوشِ جمال سے بحث کر

کے اس کی فطرت کو لچک دینا چاہی، وہ وہیں سے ٹوٹی، ایک پنجابی بہترین عامل ہے لیکن مفکر نہیں، کام کرنے کے لیے اس کی آستینیں ہر وقت چڑھی رہتی ہیں لیکن فکر و رائے کا خیال آیا اور اس پر تحیّر طاری ہوا۔ وہ سادہ ہیں لیکن پُر کار نہیں، وہ ذہین اکثر ہیں لیکن نابغہ کم تر، وہ ذراسی بات سے ممنون ہو جانے والی اور بہت کچھ کر کے بھی دوسروں کو ممنون بنانے سے سَیر نہ ہونے والی فطرت رکھتے ہیں۔ ان کی مہمان نوازیاں تقاضائے تمدن نہیں، بلکہ تقاضائے فطرت ہے اور وہ نہایت آسانی سے اپنا دل کھول کر سامنے رکھ دیتا ہے۔"

مولانا کی یہ تحریر دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ "اہلِ پنجاب" سے شروع ہو کر "خطاب کا مستحق بنادیا ہے۔" پر ختم ہوتا ہے۔ مولانا نے ان سطور میں پنجابیوں کے اوصاف بیان کرنے کی زحمت فرمائی ہے۔ میری دانست میں یہ تحریر المدح بما یشبہ الذم کی ذیل میں آتی ہے۔ دوسرا حصّہ جس میں جمالیاتی حس اور آرٹ کے نقوشِ جمال کا ذکر ہے، غیر واضح، مبہم اور المعنیٰ فی بطن الشاعر کا شاہ کار معلوم ہوتا ہے۔ ہم دو بھائیوں کی اُلٹی سیدھی باتوں سے تمام اہلِ پنجاب کے بارے میں رائے قائم کرنا جلد بازی تو کہلا سکتی ہے، پختہ کاری نہیں کہی جا سکتی۔

مولانا کی اس سرگذشتِ سفر کو میں نے تین بار بالاستیعاب پڑھا ہے اور ہر دفعہ میرے دل میں یہ تاثر اُبھرا ہے کہ مولانا کی یہ تحریر اس سلاست، روانی اور زورِ بیان سے سراسر معرا ہے، جو اُن کا خاصہ ہے۔ آمد کی جگہ آورد ہے، بعض الفاظ کا استعمال بھی قابلِ اعتراض ہے۔ فقرے ڈھیلے ڈھالے اور پھسپھسے ہیں۔ گویا مولانا نے دماغ کو بہ جبر و اکراہ ان سطور کی تسوید پر آمادہ کیا ہے، ورنہ وہ از خود آمادۂ کار نہ تھا۔

مولانا ہماری بے غرض خدمت گزاری سے کافی متاثر دکھائی دیتے تھے۔ چناں چہ بہ وقتِ رخصت کہنے لگے، میں آپ کے خلوص کا اتنا مداح اور گرویدہ ہو گیا ہوں کہ ایک دفعہ پھر یہاں آنے کی تمنّا دل کی گہرائیوں میں اُبھر رہی ہے۔ کہنے کو تو وہ کہہ گئے لیکن میری دانست میں اس خیال کے حقیقت کا روپ دھارنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اس سفر کی غرض و غایت "نگار" کے حلقۂ اثر کو وسعت دینا تھی اور اسی کشش نے مولانا کو اس پر اُکسایا تھا۔

اس درس گاہ کے معلم طلبہ ہر سال مارچ کے آخر میں فارغ ہو کر چلے جاتے اور وسط اپریل میں اتنے ہی نئے طلبہ اُن کی جگہ لینے کو آجاتے اور اس طرح یہ سلسلۂ خریداری انھی خطوط پر گذشتہ چار سال سے چلتا آرہا تھا۔ یہ

انگریزی حکومت کا دور تھا۔ سٹاف میں ہندو اور سکھ بھی تھے۔ یوں بھی انسانی معاشرہ کبھی رقابت اور حسد کے جراثیم سے مکمل محفوظ نہیں رہا اور جب ایک دفعہ کوئی کھکھیڑ اُٹھ کھڑی ہو تو جھاڑ کے کانٹے سے دامن چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں اپنے انداز میں ''نگار'' کی خدمت کرتا چلا آرہا تھا اور تاحال بفضلہٖ بتیس دانتوں میں زبان کی طرح ہر گزند سے مامون تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس عرصے کے دوران میں ایسے لوگ ہیڈ ماسٹر رہے، جو حسنِ اتفاق سے مسلمان تھے اور جنھیں میری اس بے ضرر علمی اور ادبی کاوش سے کوئی اور نہ تھی۔ انھی دنوں راولپنڈی ڈویژن میں انسپکٹر آف اسکولز کی اسامی پر ایک ایسا شخص مقرر ہوا، جو حد درجہ متعصّب اور زہریلا مہاسبھائی تھا، چناں چہ احتیاطاً میں نے بہ قولِ سعدی ارادہ کر لیا:

اگر جستم از دست آں تیر زن
من و موش و کاشانۂ پیر زن

ہر چند خریداروں کی تعداد کچھ کم ہوگئی اور مولانا کو ''نگار'' کے سالانہ چندے میں دو روپے کی تخفیف کرنا پڑی۔ پھر بھی یہ سلسلہ اپریل ۱۹۳۲ء تک چلتا رہا۔ اس ناموافق ماحول میں مجھے کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آتی تھی، جو مولانا کو کالے کوسوں کی ان منزلوں کو طے کرنے پر آمادہ کر سکے۔ اسی سال کے ماہ اکتوبر کی ابتدائی تاریخوں کا واقعہ ہے کہ غیر متوقع طور پر مولانا کا ایک پوسٹ کارڈ موصول ہوا۔ تحریر تھا کہ میں فلاں تاریخ کو فرنٹیئر میل سے پشاور جا رہا ہوں۔ آپ لوگوں سے ملاقات ہو جانا چاہیے۔ مولانا سے جو تعلق خاطر تھا، اُس کی سرشاری کی وجہ سے ہماری حالت کچھ یوں تھی:

ع ''اسد! خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے''

گاڑی غروبِ آفتاب کے وقت کیمبل پور پہنچتی تھی۔ ہم اسٹیشن پہنچے۔ گاڑی نے تھوڑی دیر ہی رُکنا تھا، ہم نے جلدی جلدی مولانا کو تلاش کیا اور مختصر سا وقت دریافتِ حال کی نذر ہو گیا۔ گاڑی نے وسل دی اور چل دی:

ع ''روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد''

مولانا کی آمد سے بیشتر ہی ہم نے طے کر لیا تھا کہ دوسرے دن مولانا کے تعاقب میں پشاور جائیں گے اور بہ اطمینان و سکون اُن کی صحبت سے لطف اندوز ہوں گے۔

دوسری صبح کو اتوار تھا۔ مولانا کی سالِ گذشتہ کی تشریف آوری کے بعد علامہ عنایت اللہ خان مشرقی (مرحوم) بھی غریب خانے کو اپنے قدوم سے مشرف فرما چکے تھے۔ ہر چند اُن کا یہ قیام چند گھنٹوں تک محدود تھا اور ہم نے اُنھیں ہوسٹل میں لانے کی بجائے قاضی محمد شفیع مرحوم ایڈووکیٹ کے دیوان خانے میں اُتارا تھا۔ علامہ مع

اہل وعیال کے اپنی کار میں تشریف لائے تھے اور رمضان تھا۔ کھانے پینے کے تکلّف کی گنجائش ہی نہ تھی اور پھر علامہ نے صاف طور پر لکھ بھی دیا تھا کہ ہم سب لوگ روزے سے ہوں گے۔ عجب تر ایں کہ علامہ صاحب کا سب سے چھوٹا بچہ اکرام احمد خان نعیم جو بہ مشکل ڈیڑھ دو برس کا ہو گا۔ اُس کے بارے میں علامہ نے بالتصریح فرمایا تھا کہ آج سے بچے کا دوسرا روزہ ہے:

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات

علامہ کی قدم رنجہ فرمائی کسی ''نگار'' کے سلسلے میں نہ تھی۔ چوں کہ یہ داستان کافی طویل ہے۔ اس لیے سرِ دست اس سے صرفِ نظر بغیر چارہ نہیں۔ جب سے ہمیں مولانا کے پروگرام کا علم ہوا تھا۔ میں نے علامہ صاحب کو خط لکھ کر ملاقات کا وقت طے کر لیا تھا۔ چناں چہ دوسرے دن میں دو ایس وی کلاس کے طلبہ کے ساتھ دس بجے صبح کے لگ بھگ اُن کے بنگلے پر پہنچ گیا۔

علامہ موٹر کار کی دیکھ بھال میں منہمک تھے۔ ہمیں دیکھ کر گاڑی کو مکینک کے حوالے کیا۔ منتظر تو تھے ہی، دیوان خانہ کھولا۔ سلسلہ کلام شروع ہوا، تو بارہ بج گئے، ہر چند گاڑی ابھی پورے طور پر ٹھیک نہیں ہوئی تھی مگر ہمیں بٹھایا اور اسلامیہ کالج پشاور دکھانے لے گئے۔ لوٹے تو کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ خود ہی کھانا اُٹھالائے اور ساتھ بیٹھ کر تناول فرمایا۔ اکتوبر کے مہینے میں دن بہت لمبے ہوتے ہیں نہ بہت چھوٹے، علّامہ سے ہم اجازت لے کر رُخصت ہوئے اور مولانا کی قیام گاہ پر پہنچے تو سہ پہر کی چائے کا وقت تھا۔

مولانا، سردار احمد خان سول جج کے بنگلے کی ایک تنگ سی کوٹھڑی میں فروکش تھے۔ جس میں مولانا کی چارپائی کے علاوہ بہ مشکل ایک کرسی کی گنجائش تھی۔ میں اس کرسی پر براجمان ہو گیا اور میرے دونوں ساتھی مولانا کی پائنتی پر ٹک گئے۔ اتنے میں سردار صاحب بھی کسی کام سے آ گئے، وہ کہاں بیٹھتے، مولانا ایک تپلی سے رضائی اوڑھے بیٹھے تھے۔ ذرا سُکڑے تو سردار صاحب کے لیے تھوڑی سی جگہ نکل آئی۔ مولانا نے ہماری طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''یہ احباب کیمبل پور سے آئے ہیں۔'' اُن کی بلا سے، کہیں سے آئے ہوں۔ ایک غلط انداز نظر ڈالی۔ بس علیک سلیک کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ گویا صورتِ حال کچھ یوں تھی: ''واں وہ غرورِ عز و نازیاں یہ حجابِ پاسِ وضع'' سردار صاحب دو اڑھائی منٹ کے بعد اُٹھ کر چلے گئے۔ میں اُن کے اس غیر روایتی طریق پذیرائی سے خفیف ہوا اور ملول بھی۔ کیوں کہ فطرتاً پٹھان عالی ظرف اور مہمان نواز واقع ہوئے ہیں۔ مہمان کتنا ہی ہیچ میرز کیوں نہ ہو، اس سے بے اعتنائی برتنا، اُن کی ''پٹھان وَلی'' کی توہین ہے۔ اس بدمزگی نے ہمیں بیٹھنے نہ دیا۔ مولانا سے اجازت مانگی اور بدھو میاں خیر سے شام کو گھر لوٹ آئے۔

سر دار صاحب کا شمار سر حد کے اُن دبنگ اور درد مند مسلمان افسروں میں ہوتا تھا، جن سے ہندوؤں کا دولت مند طبقہ اور افسر یکساں طور پر خم کھاتے تھے۔ وہ بڑے دین دار، ہمدرد اور خلاص کیش انسان تھے۔ اپنی آن پر حرف نہیں آنے دیتے تھے اور جہاں قومی وقار کا سوال پیدا ہوتا، مقابلے پر ڈٹ جاتے اور عواقب سے بے نیاز ہو کر ملّی حقوق کا دفاع کرتے۔ سر دار صاحب بعد میں کسی بات پر ناراض ہو کر مستعفی ہو گئے تھے۔ مولانا وہاں کس غرض کے لیے مقیم تھے؟ اس کا کچھ علم نہ ہو سکا۔ اگر تنہائی میسّر آتی تو شاید پوچھ لیتا۔ ایک ادھیڑ عمر ادیب اور سول جج میں کوئی ایسی قدر مشترک نظر نہ آئی، جو اُنھیں ایک قفس نما کوٹھڑی میں جمع کر دے۔ مولانا سولہ دن وہاں مقیم رہے۔ ہمیں اُن کی واپسی کی اطلاع اُس وقت ہوئی۔ جب وہ لاہور پہنچ چکے تھے۔ نومبر کے ''نگار'' میں مولانا نے اس سفر کی غرض و غایت کے بارے میں صرف اتنا لکھا کہ میں بعد میں کسی موقع پر قارئین کے جذبۂ تجسس کی تسکین کے لیے صورتِ حال کی وضاحت کر دوں گا لیکن جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے، اس کی نوبت نہ آ سکی۔

میں نے سر دار صاحب کے مولانا کی کوٹھڑی میں آنے اور چند منٹ ٹھہرنے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ ابھی تک میزبان اور مہمان میں گرم جوشی، بے تکلّفی اور اپنایت پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ ہر چند سر دار صاحب کا روّیہ ایسا ہی تھا، جیسا کہ ایک شریف آدمی کا ایک مہمانِ عزیز سے ہونا چاہیے لیکن مولانا کا طریقۂ گفتگو معمول کے مطابق نہ تھا۔ اُن کی حرکات و سکنات میں ایک طرح کا تصنع اور لب و لہجے میں لجاجت تھی۔ مجھے یہ انداز پسند نہ آیا، بلکہ میرے ایک ساتھی نے راستے میں مولانا کی اس ایکٹنگ (Acting) پر عجیب و غریب فقرہ کسا، جس کا مطلب یہ تھا کہ مولانا اس غیر ضروری انکسار اور تواضع کے اظہار سے سر دار صاحب کو یہ بتا رہے تھے کہ آپ نے یہاں بلا کر ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ سر دار صاحب ایک بااثر اور معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن مولانا بھی اپنے علمی وقار، ادبی وجاہت او محققانہ طرزِ نگارش کی بنا پر بڑے سے بڑے صاحبِ منصب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتے تھے۔ حکومتی مناصب اور دُنیوی جاہ و جلال آنی اور فانی ہیں، جب کہ علم و ادب کی بے بہا دولت اور تحقیق و تدقیق کا خداداد جوہر ایک دائمی اور ابدی حقیقت ہے۔